ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1915

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس :معاصر اسلامی فکری مسائل • (1915) سطح :بی ایس علومِ اسلامیہ / عربی

سمسٹر :خزاں2026

امتحانی مشق نمبر ۱) یونٹ 1 تا(4

کل نمبر • 100 کے بی کے نمبر50 :

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

)مطالعہ و حوالہ کے لیے(

USMAN NOTES www.usmannotes.com

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کر کے جوابات اپنے الفاظ میں تحریر کریں؛ بعینہٖ نقل کرنا امتحانی قواعد کے خلاف ہے۔

سوال نمبر ۱ :قومی وسائل کی منصفانہ تقسیم کے بنیادی اصول 20) نمبر(

سوال نمبر ۱ ۔ اسلامی ریاست میں قومی وسائل کی منصفانہ تقسیم کے بنیادی اصول کیا ہیں؟

تعارف

دولت و وسائل کی تقسیم کسی بھی معاشرے کا سب سے حساس اور فیصلہ کن مسئلہ ہے۔ اگر وسائل چند ہاتھوں میں سمٹ جائیں تو معاشرے میں محرومی، بغاوت اور انتشار پیدا ہوتا ہے، اور اگر تقسیم عدل پر مبنی ہو تو معاشرہ امن، خوشحالی اور باہمی محبت کا گہوارہ بنتا ہے۔ اسلام نے معاشیات کو اخلاقیات سے جدا نہیں کیا بلکہ تقسیمِ دولت کو عدل و احسان کے مرکزی اصول کے تابع قرار دیا ہے۔ اسلامی ریاست میں قومی وسائل کی منصفانہ تقسیم کا دار و مدار

چند بنیادی اصولوں پر ہے جن کی جڑیں قرآن و سنت میں موجود ہیں اور جن پر عمل پیرا ہو کر ریاستِ مدینہ اور خلافتِ راشدہ کے دور میں ایک منصفانہ معاشی نظام قائم کیا گیا۔ ذیل میں ان اصولوں کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

اصل ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے

اسلامی معاشی فکر کا سب سے پہلا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ زمین و آسمان کی تمام نعمتوں اور وسائل کی اصل ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ انسان کو ان وسائل پر خلیفہ اور امین کی حیثیت حاصل ہے، مطلق مالک کی نہیں۔ قرآن مجید فرماتا ہے" :اور ان کے مال میں سے جو اللہ نے انہیں دیا ہے) اس میں سے (خرچ کرو) "الحدید(7 :۔ اسی طرح ارشاد ہے" :اور اللہ ہی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے) "آل عمران(129 :۔ اس اصول کا عملی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی فرد، طبقہ یا ادارہ قومی وسائل کو اپنی نجی جاگیر سمجھ کر صرف اپنے مفاد میں استعمال نہیں کر سکتا۔ ریاست کا حکمران بھی ان وسائل کا امین ہے اور اسے ہر شہری کے حق کا لحاظ رکھتے ہوئے تقسیم کرنا ہوتی ہے۔ یہی تصورِ امانت سرمایہ دارانہ نظام کے اس لامحدود حقِ ملکیت سے بنیادی طور پر مختلف ہے جس میں وسائل کی تقسیم کا واحد معیار بازاری قوت ہوتا ہے۔

عدل و مساوات کا اصول

تقسیمِ وسائل کا دوسرا بڑا اصول عدل ہے۔ قرآن مجید نے عدل کو تقویٰ کے قریب ترین عمل قرار دیا ہے" :انصاف کرو، یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے) "المائدہ(8 :۔ اسلامی ریاست میں وسائل کی تقسیم میں نسل، رنگ، زبان، خاندان اور مذہبی وابستگی) قانونی حدود کے اندر (کی بنیاد پر کوئی غیر منصفانہ امتیاز نہیں برتا جاتا۔ حضور اکرم ﷺ نے ریاستِ مدینہ میں مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کر کے عملی طور پر دکھا دیا کہ وسائل میں شراکت عدل کی عملی صورت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بیت المال سے وظائف کی تقسیم میں پہلے اہلِ بدر، پھر دیگر صحابہ اور پھر عام شہریوں کی سابقیّتِ اسلام اور ضرورت کو ملحوظ رکھا گیا، لیکن کسی کو بنیادی کفالت سے محروم نہیں رکھا گیا۔ یہ مساوات مطلق یکسانیت نہیں بلکہ حقوق کی ضمانت اور موقع کی برابری پر مبنی ہے۔

دولت کی گردش اور ارتکاز کی ممانعت

اسلام چاہتا ہے کہ دولت معاشرے میں گردش کرتی رہے اور چند امراء کے ہاتھوں میں مرکوز نہ ہو جائے۔ قرآن مجید نے مالِ فئی کی تقسیم کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا" :تاکہ وہ) دولت (تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتی رہے) "الحشر(7 :۔ یہ آیت ارتکازِ دولت کی ممانعت کا آئینی اصول فراہم کرتی ہے۔ اسی مقصد کے لیے اسلام نے سود کو حرام قرار دیا کیونکہ سود دولت کو محنت کش طبقے سے کھینچ کر سرمایہ دار تک پہنچاتا ہے؛ زکاۃ کو فرض کیا تاکہ جمع شدہ دولت کا ایک حصہ ہر سال مستحقین کی منتقل ہوتا رہے؛ میراث کے قانون کے ذریعے دولت کو ایک وارث کے بجائے متعدد رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا؛ اور غبن، احتکار) ذخیرہ اندوزی (اور جوا وغیرہ کو ممنوع قرار دیا۔ ان تمام اقدامات کا مشترکہ مقصد یہی ہے کہ قومی وسائل پوری قوم میں گردش کرتے رہیں اور معاشی عدم توازن پیدا نہ ہو۔

ضرورت اور کفالتِ عامہ کا اصول

اسلامی تقسیم کا تیسرا اصول یہ ہے کہ ہر شہری کی بنیادی ضروریات — روٹی، کپڑا، مکان، علاج اور تعلیم — کی کفالت کی ذمہ داری ریاست پر ہے۔ حدیثِ مبارکہ ہے" :حکمران رعایا کا نگران ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا) "بخاری و مسلم(۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے کہ اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو میں اس کا ذمہ دار ٹھہروں گا۔ اسی اصول کے تحت بیت المال سے یتیموں، بیواؤں، معذوروں، بوڑھوں اور بے روزگاروں کے وظائف مقرر کیے جاتے ہیں۔ تقسیم میں پہلا حق ان طبقات کا ہوتا ہے جو خود کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا جن کی آمدنی بنیادی ضروریات کے لیے ناکافی ہے۔ یہ اصول سرمایہ دارانہ تقسیم سے بالکل مختلف ہے جہاں تقسیم کا پیمانہ صرف" ادائیگی کی صلاحیت "ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں غریب ضروری اشیاء سے بھی محروم رہتا ہے۔

اہلیت، محنت اور استحقاق کا توازن

عدل یہ نہیں کہ سب کو برابر برابر دے دیا جائے، بلکہ عدل یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کا حق ملے۔ اسلام نے محنت اور صلاحیت کو بھی تسلیم کیا ہے" :انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے کوشش کی) "النجم(39 :۔ اس لیے اسلامی نظام میں ایک طرف نجی ملکیت اور جائز محنت کی کمائی کا تحفظ ہے، تو دوسری طرف اجتماعی وسائل — مثلاً

معدنیات، جنگلات، پانی، چراگاہیں اور بنجر زمینوں کی آمدنی — کو پورے معاشرے کی مشترکہ ملکیت قرار دیا گیا ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں ہے" :مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں :پانی، چراگاہ اور آگ) "ابوداؤد(۔ فقہاء نے اس سے یہ اصول اخذ کیا کہ وہ وسائل جن پر پورے معاشرے کی زندگی کا انحصار ہے، کسی فرد کی نجی ملکیت میں نہیں دیے جا سکتے؛ ان کی آمدنی بیت المال کے ذریعے سب کی فلاح پر خرچ ہوگی۔ یوں اسلام اہلیت و محنت کی ترغیب اور اجتماعی انصاف کے درمیان حسین توازن قائم کرتا ہے۔

زکاۃ، صدقات اور بیت المال کا ادارہ جاتی نظام

اصولوں کو عملی شکل دینے کے لیے اسلام نے باقاعدہ ادارے فراہم کیے ہیں۔ ذیل کی جدول میں اہم اداروں اور ان کے تقسیمی کردار کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے:

جدول :اسلامی معاشی ادارے اور تقسیم وسائل میں ان کا کردار

تقسیمی کردار	مستحقین	ماخذ / بنیاد	ادارہ
دولت کو امراء سے غریبوں کی طرف منتقل کرنا	فقراء، مساکین، یتیم، مقروض وغیرہ) التوبہ(60 :	فرض عبادت؛ مال کا اڑھائی فیصد	زکاۃ
دولت کی گردش؛ ارتکاز کی روک تھام	ریاستی مصالح اور متعلقہ مستحقین) الحشر(7 :	جنگ و صلح سے حاصل سرکاری آمدنی	مالِ فئی و خمس
عوامی خدمات اور کفالتِ عامہ کی تمویل	بیت المال کے ذریعے عوامی فلاح	زمین و پیداوار پر محصول	خراج و عشور
تعلیم و صحت میں نجی شعبے کی شراکت	طلبہ، مریض، مسافر اور عام عوام	رضاکارانہ دائمی صدقہ	وقف
فوری سماجی تحفظ اور ہنگامی امداد	فقراء و مساکین	نفلی خیرات اور شرعی کفارے	صدقات و کفارات

ان اداروں کے علاوہ وقف کا نظام تعلیم، صحت اور فلاحِ عامہ کے لیے وسائل مخصوص کرتا ہے، اور کفارات و فدیے بھی سماجی تحفظ کا حصہ ہیں۔ یہ ادارہ جاتی ڈھانچہ اس بات کی ضمانت ہے کہ منصفانہ تقسیم محض اخلاقی نصیحت نہ رہے بلکہ ریاستی نظام کا مستقل حصہ بن جائے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں قومی وسائل کی منصفانہ تقسیم کے بنیادی اصول یہ ہیں :اصل ملکیت کا حق اللہ کے لیے تسلیم کر کے انسان کو امین سمجھنا؛ ہر شہری کے ساتھ بلا امتیاز عدل کرنا؛ دولت کی گردش کو یقینی بنا کر ارتکازِ دولت روکنا؛ ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت کو ریاست کی ذمہ داری قرار دینا؛ محنت و اہلیت کا حق تسلیم کرتے ہوئے اجتماعی وسائل کو مشترکہ ملکیت سمجھنا؛ اور زکاۃ، فیٔ، خراج و بیت المال جیسے اداروں کے ذریعے ان اصولوں کو نافذ کرنا۔ ان اصولوں پر عمل سے ہی ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے جس میں دولت چند ہاتھوں کی لونڈی نہ ہو بلکہ پورے معاشرے کی خوشحالی کا ذریعہ بنے۔

سوال نمبر ۲ :خاندانی معاملات میں عدالتی نظام کے پابند اسلامی اصول 20) نمبر(

سوال نمبر ۲۔ خاندانی معاملات میں عدالتی نظام کو کن اسلامی اصولوں کا پابند ہونا چاہیے؟

تعارف

خاندان معاشرے کی بنیادی اکائی ہے، اور خاندانی تنازعات — نکاح، طلاق، خلع، حضانت) بچوں کی پرورش(، نفقہ، وراثت اور نسب وغیرہ — اپنی نوعیت میں عام دیوانی مقدمات سے مختلف ہوتے ہیں کیونکہ ان میں قانونی پہلو کے ساتھ جذبات، عزتِ نفس، رازداری اور بچوں کے مستقبل جیسے حساس معاملات شامل ہوتے ہیں۔ اسلام نے خاندان کو محبت و رحمت کا ادارہ قرار دیا ہے، اس لیے جب کوئی خاندانی معاملہ عدالت تک پہنچے تو اسلام چاہتا ہے کہ عدالتی نظام محض قانونی ضابطوں کا پابند نہ رہے بلکہ مخصوص اسلامی اصولوں کے تحت فیصلے کرے تاکہ انصاف کے ساتھ ساتھ خاندان کا تحفظ، فریقین کی عزت اور معاشرتی سکون بھی برقرار رہے۔ ذیل میں ان اصولوں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

شریعت کی بالادستی اور عدل و انصاف

پہلا اصول یہ ہے کہ خاندانی معاملات میں عدالت کا فیصلہ شریعت کے مقرر کردہ حدود و احکام کے مطابق ہو۔ قرآن مجید نے حکم دیا ہے" :پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ) "النساء(59 :۔ نکاح و طلاق، مہر، نفقہ اور وراثت کے احکام قرآن نے واضح طور پر بیان کر دیے ہیں؛ قاضی ان میں اپنی رائے یا سماجی دباؤ کی بنیاد پر تبدیلی نہیں کر سکتا۔ دوسرا اسی سے جڑا اصول عدل ہے :عدالت شوہر اور بیوی، سسرال اور میکے، امیر اور غریب کے درمیان بلا امتیاز انصاف کرے۔ قرآن کا حکم ہے کہ کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں ناانصافی پر آمادہ نہ کرے)المائدہ(8 :۔ خاندانی مقدمات میں اکثر ایک فریق سماجی و معاشی لحاظ سے طاقتور ہوتا ہے؛ عدالت کی ذمہ داری ہے کہ کمزور فریق کو اس کے قانونی حق سے محروم نہ ہونے دے، چاہے وہ بیوی ہو، یتیم بچہ ہو یا ضعیف والدین۔

صلح و مفاہمت کو ترجیح

اسلامی عدالتی نظام کا ممتاز اصول یہ ہے کہ خاندانی تنازعات میں فیصلے سے پہلے صلح کی ہر ممکن کوشش کی جائے، کیونکہ قرآن نے فرمایا" :صلح) میں (بہتری ہے) "النساء(128 :۔ میاں بیوی کے اختلاف کی صورت میں قرآن نے باقاعدہ طریقہ مقرر کیا ہے" :اگر تم دونوں کے درمیان دراڑ پڑنے کا خدشہ ہو تو ایک ثالث مرد کے گھر والوں سے اور ایک ثالث عورت کے گھر والوں سے مقرر کرو؛ اگر دونوں صلح چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا) "النساء(35 :۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عدالت کو مقدمہ سننے سے پہلے ثالثی اور مفاہمت کا مرحلہ اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ خاندانی مقدمے میں" جیتنے "والا فریق بھی عموماً خاندان ہار چکا ہوتا ہے۔ جدید دور کی فیملی کورٹس میں مصالحتی کارروائی (mediation) کا تصور اسی اسلامی اصول کی عملی صورت ہے۔ قاضی کو چاہیے کہ وہ فریقین کو علیحدگی سے پہلے مفاہمت کا پورا موقع دے، البتہ ظلم و زیادتی کی صورت میں صلح کے نام پر مظلوم پر دباؤ نہ ڈالا جائے۔

رازداری، پردہ اور عزتِ نفس کا تحفظ

خاندانی مقدمات کی سماعت میں فریقین کے ذاتی راز، عورتوں کی عزت اور خاندان کی ساکھ کا تحفظ ایک بڑا اسلامی اصول ہے۔ قرآن مجید نے بیویوں کے معاملات میں بھی" معروف "یعنی بھلے طریقے سے پیش آنے کا حکم دیا ہے اور عیب جوئی و تجسس سے منع کیا ہے" :اور ایک دوسرے کی ٹوہ نہ لگاؤ) "الحجرات(12 :۔ اس اصول کی روشنی میں عدالت پر

لازم ہے کہ خاندانی مقدمات کی سماعت ضرورت کے مطابق بند کمرے (in-camera) میں ہو، مقدمے کی تفصیلات کو غیر ضروری تشہیر سے بچایا جائے، اور خواتین و بچوں کو بار بار عدالت کے چکر اور توہین آمیز جرح سے تحفظ ملے۔ عدالتی اہلکاروں کا رویہ بھی وقار اور شفقت پر مبنی ہو؛ کسی فریق کی تذلیل یا کردار کشی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ اصول اس لیے بھی اہم ہے کہ خاندانی تنازع کی تشہیر عموماً فریقین کے درمیان مستقل دشمنی کا بیج بو دیتی ہے جو صلح کے تمام دروازے بند کر دیتا ہے۔

بچوں کے مفاد کو مقدم رکھنا

حضانت اور بچوں سے متعلق مقدمات میں اسلام کا رہنما اصول بچے کا مفاد) مصلحتِ طفل (ہے۔ اگرچہ فقہاء نے ماں، نانی، باپ وغیرہ کی حضانت کا ایک ترتیب وار حق مقرر کیا ہے، مگر اس کی روح یہی ہے کہ بچہ اس کے پاس رہے جو اس کی دینی، اخلاقی، جسمانی اور تعلیمی تربیت بہتر کر سکے۔ نبی کریم ﷺ نے بیٹے کو فرمایا" :تم اس) بچے (کی زیادہ حقدار ہو جب تک نکاح نہ کرو) "ابوداؤد(، جس سے ماں کی فطری شفقت کو تسلیم کیا گیا۔ عدالت پر لازم ہے کہ وہ والدین کی باہمی دشمنی کو بچے کے مستقبل کی قیمت پر جیتنے نہ دے؛ نفقہ اولاد، تعلیم، صحت اور ملاقات کے حقوق میں فیصلہ ہمیشہ بچے کے بہترین مفاد کو سامنے رکھ کر ہو۔ اسی طرح یتیموں کے مال و وراثت کے مقدمات میں عدالت کو خصوصی نگرانی رکھنی چاہیے کیونکہ قرآن نے یتیم کا مال کھانے کو آگ کھانے کے مترادف قرار دیا ہے) النساء(10 :۔

گواہی، ثبوت اور جلد و سستا انصاف

اسلامی عدالتی اصولوں میں بروقت اور غیر جانبدار ثبوت کا نظام بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ حدیثِ مبارکہ ہے" :ثبوت پیش کرنا مدعی کے ذمے ہے اور قسم مدعیٰ علیہ پر ہے) "ترمذی(۔ خاندانی مقدمات میں عدالت کو چاہیے کہ وہ فریقین کو سنے بغیر فیصلہ نہ کرے، گواہوں کی جانچ دیانت داری سے کرے اور جھوٹے گواہ یا جھوٹے الزام کو سنگین جرم سمجھے، کیونکہ حدِ قذف کا قانون اسی مقصد کے لیے ہے کہ عزتوں پر الزام تراشی نہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے تاخیر کو انصاف کی نفی قرار دیا ہے۔ خاندانی مقدمات — خصوصاً نفقہ اور حضانت — میں تاخیر عموماً کمزور فریق کو حقیقی سزا دے دیتی ہے، اس لیے عدالت کو چاہیے کہ مقدمات کا فوری فیصلہ کرے، عبوری نفقہ interim)

maintenance) بروقت مقرر کرے اور عدالتی فیس و اخراجات اس قدر کم رکھے کہ غریب عورت یا یتیم بچہ انصاف سے محض اخراجات کی وجہ سے محروم نہ رہے۔ انصاف تک رسائی کی آسانی بھی عدل کا حصہ ہے۔

رحم، نرمی اور انسانی ہمدردی

آخری اہم اصول یہ ہے کہ خاندانی عدالتی کارروائی میں قانون کی سختی کے ساتھ رحمت و شفقت کا پہلو بھی نمایاں رہے۔ قرآن نے شوہر کو بھی علیحدگی کی صورت میں "احسان کے ساتھ رخصت" کرنے کا حکم دیا ہے (البقرہ 229:) اور طلاق کے بعد بھی عورت کے حقوق — عدت کا نفقہ، مہر، متاع — محفوظ رکھے ہیں۔ قاضی کا منصب صرف سزا دینا یا معاہدہ توڑنا نہیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنا، فریقین کی نفسیاتی کیفیت کو سمجھنا اور فیصلے کو اس انداز میں نافذ کرنا ہے کہ دشمنی کم سے کم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے خاندانی مقدمات میں قاضی کے لیے علم کے ساتھ حکمت، صبر اور تجربے کو بھی شرط قرار دیا ہے۔ عدالت اگر محض ضابطہ پرستی میں مبتلا ہو جائے تو خاندانی تنازعات نسل در نسل دشمنیوں میں بدل جاتے ہیں۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ خاندانی معاملات میں عدالتی نظام کو جن اسلامی اصولوں کا پابند ہونا چاہیے وہ یہ ہیں (1): شریعت کے احکام کی بالادستی اور بلا امتیاز عدل؛ (2) فیصلے سے پہلے صلح و ثالثی کو ترجیح؛ (3) فریقین کی رازداری، پردہ اور عزتِ نفس کا تحفظ؛ (4) حضانت و نفقے میں بچوں کے مفاد کو مقدم رکھنا اور یتیموں کے حقوق کی خصوصی نگرانی؛ (5)معیاری ثبوت و گواہی کے ساتھ جلد اور سستا انصاف؛ اور (6) قانونی کارروائی میں رحمت و ہمدردی کا انداز۔ ان اصولوں پر عمل سے عدالت نہ صرف انصاف فراہم کرتی ہے بلکہ خاندانی ادارے کی بقا اور معاشرتی سکون کی ضمانت بھی بن جاتی ہے۔

سوال نمبر ۳ :اسلام کے نزدیک تعلیم کے حق کی شرعی حیثیت 20) نمبر(

سوال نمبر ۳۔ اسلام کے نزدیک تعلیم کے حق کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

تعارف

تعلیم انسانی شخصیت کی تعمیر اور معاشرے کی ترقی کی بنیاد ہے۔ جدید دنیا نے تعلیم کو بنیادی انسانی حق قرار دے کر اسے آئینی دستاویزات میں شامل کیا ہے، لیکن اسلام نے چودہ سو سال پہلے تعلیم کو نہ صرف حق بلکہ فرض قرار دے دیا تھا۔ وحی کا آغاز ہی لفظ" اقرا ("پڑھ (سے ہوا، اور قرآن نے قلم اور کتابت کو اللہ کی عظیم نعمت کے طور پر پیش کیا۔ سوال یہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے تعلیم کے حق کی حیثیت کیا ہے — آیا یہ محض ایک سماجی سہولت ہے، ریاست کی مرضی پر مبنی رعایت ہے، یا شریعت نے اسے لازم قرار دیا ہے؟ ذیل میں قرآن و سنت اور فقہی آراء کی روشنی میں اس سوال کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔

قرآنی بنیادیں :علم کی فرضیت و فضیلت

قرآن مجید کی پہلی وحی میں پڑھنے کا حکم اور قلم کی تعریف موجود ہے" :پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا ...جس نے قلم کے ذریعے سکھایا؛ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا("العلق(5–1 :۔ یہ ترتیب خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام کی دعوت کا آغاز علم سے ہوتا ہے۔ قرآن نے اہلِ علم کی فضیلت اس طرح بیان کی" :کہہ دیجیے :کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں؟) "الزمر (9 :اور" اللہ تم میں سے ایمان والوں اور جنہیں علم دیا گیا ان کے درجے بلند کرے گا) "المجادلہ(11 :۔ جو لوگ علم نہیں رکھتے انہیں علماء سے پوچھنے کا حکم دیا گیا) النحل : (43۔ ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ علم حاصل کرنا محض پسندیدہ عمل نہیں بلکہ دینی زندگی کی شرط ہے، کیونکہ عقائد، عبادات اور معاملات کی درست ادائیگی علم کے بغیر ممکن نہیں۔ جس چیز کے بغیر فرائض ادا نہ ہوں، فقہی اصول کے مطابق اس کا حاصل کرنا بھی فرض ہو جاتا ہے" :جس کے بغیر واجب مکمل نہ ہو وہ بھی واجب ہے"۔

احادیثِ نبوی اور حقِ تعلیم

نبی کریم ﷺ نے فرمایا" :علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے) "ابن ماجہ(۔ یہ حدیث تعلیم کے حق کی شرعی حیثیت کو واضح کرتی ہے :جب علم حاصل کرنا فرض ہے تو اس فرض کی ادائیگی کے لیے تعلیم کی فراہمی بھی معاشرے و ریاست پر لازم ہو جاتی ہے، کیونکہ حق اور فرض ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ آپ ﷺ نے علم کی راہ چلنے والے کو جنت کے راستے پر چلنے والا قرار دیا) مسلم (اور فرمایا کہ جو شخص علم سیکھنے کے لیے نکلتا ہے وہ اللہ کی راہ میں ہوتا ہے

حتیٰ کہ واپس لوٹے) ترمذی(۔ عملی طور پر آپ ﷺ نے مسجدِ نبوی میں صفّہ کا تعلیمی ادارہ قائم کیا، بدر کے قیدیوں کو مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے عوض رہائی دی، اور مختلف قبائل کی طرف معلم بھیجے۔ یہ تمام اقدامات ثابت کرتے ہیں کہ تعلیم اسلام میں فرد کا ناقابلِ تنسیخ حق ہے جس کی فراہمی اجتماعی ذمہ داری ہے۔

فرضِ عین و فرضِ کفایہ کی تقسیم

فقہاء و علماء نے تعلیم کے وجوب کو دو درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا درجہ فرضِ عین ہے :اتنا علم ہر مسلمان مرد و عورت پر لازم ہے جس کے بغیر اس کے عقائد درست نہ ہوں، عبادات) نماز، روزہ، زکاۃ، حج (صحیح طور پر ادا نہ ہوں اور حلال و حرام کی پہچان نہ ہو۔ اس درجے کی تعلیم سے کسی کو محروم کرنا شرعاً جائز نہیں۔ دوسرا درجہ فرضِ کفایہ ہے :طب، انجینئرنگ، حساب، صنعت، زراعت اور دیگر اجتماعی ضرورت کے علوم؛ اگر معاشرے کے کچھ افراد ان میں مہارت حاصل کر لیں تو سب سے فرض ساقط ہو جاتا ہے، لیکن اگر کوئی بھی اسے نہ سیکھے تو پورا معاشرہ گناہگار ہوتا ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں اسی تقسیم کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس تقسیم سے تعلیم کے حق کی شرعی نوعیت واضح ہوتی ہے :بنیادی دینی تعلیم ہر فرد کا ذاتی حق بھی ہے اور فرض بھی، جب کہ تخصصی تعلیم پوری امت کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔

عورت کی تعلیم کا حق

شرعی حیثیت کے باب میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ تعلیم کا حق مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی یکساں حاصل ہے۔ حدیث" علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے "میں لفظ مسلم عام ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خود بڑی فقیہہ و محدثہ تھیں اور صحابہ کرام ان سے مسائل پوچھا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے خواتین کے لیے الگ دن مقرر فرمایا تاکہ وہ سوالات پوچھ سکیں) بخاری(، اور انصار کی عورتوں کی حیا کو علم سیکھنے میں رکاوٹ نہ بننے کی تعریف فرمائی۔ تاریخِ اسلام میں خواتین محدثات، فقیہات اور شاعرات کی طویل فہرست موجود ہے۔ لہٰذا کسی عورت یا بچی کو محض اس کے صنف کی بنیاد پر تعلیم سے محروم کرنا شریعت کی منشا کے خلاف ہے۔ والدین پر اولاد) بیٹا ہو یا بیٹی (کی تعلیم و تربیت فرض ہے، اور جو والدین اولاد کو بنیادی دینی تعلیم سے بھی محروم رکھیں وہ شرعاً اس کی ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتے۔

ریاست اور معاشرے کی ذمہ داری

جب تعلیم فرد کا شرعی حق اور فرض ہے تو اس کی فراہمی ریاست اور معاشرے کی ذمہ داری ٹھہرتی ہے۔ خلافتِ راشدہ میں بیت المال سے معلمین کی تنخواہیں ادا کی جاتیں اور مساجد تعلیم کے مراکز تھے۔ بعد کے ادوار میں وقف کے نظام نے مدارس و جامعات کا جال بچھایا؛ نظامِ نظامیہ سے لے کر جامعہ ازہر اور قرطبہ و بغداد کی جامعات تک، تعلیم عموماً مفت فراہم کی جاتی تھی تاکہ غریب طالب علم بھی محروم نہ رہے۔ شرعی اصول یہی ہے کہ ریاست بنیادی تعلیم مفت اور لازمی فراہم کرے۔ جدید دور میں پاکستان کے آئین کا آرٹیکل 25-A پانچ سے سولہ سال کی عمر تک مفت و لازمی تعلیم (اسی اسلامی اصول کی آئینی صورت ہے۔ اسی طرح معاشرے کے مالدار افراد پر وقف و صدقات کے ذریعے تعلیمی اداروں کی سرپرستی اجتماعی فریضہ ہے۔ کسی بچے کو غربت کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہنا پڑے تو یہ محرومی صرف سماجی ناکامی نہیں بلکہ شرعی ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی بھی ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک تعلیم کے حق کی شرعی حیثیت محض ایک اخلاقی ترغیب یا حکومتی رعایت کی نہیں ہے بلکہ یہ شریعت کا مقرر کردہ لازم حق ہے :بنیادی دینی علم ہر مسلمان مرد و عورت پر فرضِ عین ہے؛ اجتماعی ضرورت کے علوم فرضِ کفایہ ہیں؛ والدین پر اولاد کی تعلیم، ریاست پر مفت و لازمی بنیادی تعلیم کی فراہمی اور معاشرے پر تعلیمی اداروں کی سرپرستی شرعاً لازم ہے۔ تعلیم سے محرومی فرد کے حق کی پامالی اور اجتماعی فرض کی ترک کاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب نے تاریخ میں تعلیم کو عبادت کا درجہ دے کر اسے ہر طبقے تک پہنچایا، اور آج بھی مسلمان معاشروں کی پسماندگی کا ایک بڑا سبب اسی شرعی حق کی فراموشی ہے۔

سوال نمبر ۴ :اسلامی ریاست میں اقلیتوں کے معاشی و مذہبی حقوق 20) نمبر(

سوال نمبر ۴۔ اسلامی ریاست میں اقلیتوں کے معاشی اور مذہبی حقوق کی نوعیت کیا ہے؟

تعارف

ہر کثیر المذاہب ریاست کے سامنے یہ بنیادی سوال ہوتا ہے کہ اقلیتی شہریوں کے حقوق کی نوعیت کیا ہو۔ جدید دنیا اس سوال کا جواب شہریت کے مساویانہ تصور سے دیتی ہے، جب کہ اسلام نے ریاستِ مدینہ کے قیام کے ساتھ ہی اس مسئلے کا باقاعدہ حل پیش کر دیا تھا۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہریوں کو" ذمی "کہا جاتا ہے، یعنی وہ لوگ جن کی جان، مال، عزت اور مذہبی آزادی کی حفاظت کا ذمہ (ضمانت (اللہ، رسول اور ریاست نے لیا ہے۔ یہ تحفظ کوئی احسان یا عارضی رعایت نہیں بلکہ ایک شرعی معاہدہ ہے جسے توڑنا گناہ ہے۔ ذیل میں اقلیتوں کے مذہبی اور معاشی حقوق کی نوعیت کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

تاریخی و شرعی بنیاد :میثاقِ مدینہ اور ذمہ کا معاہدہ

اقلیتوں کے حقوق کی بنیاد میثاقِ مدینہ ہے جس میں یہودِ مدینہ کو مسلمانوں کے ساتھ ایک امت کا شریک قرار دیتے ہوئے ان کے مذہب، جان اور مال کی حفاظت کی ضمانت دی گئی۔ قرآن مجید نے مذہبی آزادی کا اصول واضح الفاظ میں بیان کیا" :دین میں کوئی زبردستی نہیں) "البقرہ (256 :اور" تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین) "الکافرون : (6۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" :خبردار !جس نے کسی ذمی) معاہد غیر مسلم (پر ظلم کیا یا اس کا حق کم کیا یا اس کی طاقت سے بڑھ کر اس پر بوجھ ڈالا یا اس کی رضا کے بغیر اس سے کچھ لیا، تو قیامت کے دن میں اس کے خلاف) اللہ کے حضور (مقدمہ لڑوں گا) "ابوداؤد(۔ اس سخت تنبیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اقلیتوں کے حقوق اسلام میں آئینی تحفظ (constitutional protection)کی حیثیت رکھتے ہیں، حکمران کی مرضی کی رعایت نہیں۔

مذہبی حقوق

مذہبی حقوق میں سب سے پہلا حق عقیدے کی آزادی ہے :کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، اور اس وجہ سے اسے سزا یا امتیازی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ دوسرا حق عبادت کی آزادی ہے :اقلیتوں کو اپنے گرجاؤں، کلیساؤں، مندروں اور عبادت گاہوں میں اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے کی اجازت ہے؛ موجودہ عبادت گاہوں کی مرمت اور اپنے مذہبی تہوار منانے کا حق بھی اسی میں شامل ہے۔ ان کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی شرعاً ممنوع ہے؛ قرآن نے حتیٰ کہ کفار کے معبودوں کو بھی گالی دینے سے منع کیا ہے تاکہ ان کی دل آزاری نہ ہو) الانعام(108 :۔ تیسرا حق اپنے

مذہبی شخصی قوانین (Personal Law) پر عمل ہے :نکاح، طلاق، وراثت اور دیگر خاندانی معاملات میں اقلیتیں اپنے مذہب کے مطابق فیصلے کروا سکتی ہیں، اور ایسی اشیاء جو ان کے مذہب میں حلال مگر اسلام میں حرام ہیں) مثلاً شراب یا خنزیر (انہیں اپنے ذاتی استعمال میں روکا نہیں جاتا، بشرطیکہ عوامی نظم متاثر نہ ہو۔ چوتھا حق مذہبی تعلیم و تبلیغِ ذات کا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے مذہب کی تعلیم دے سکیں۔

معاشی حقوق

معاشی میدان میں اقلیتی شہریوں کو مسلمان شہریوں کے برابر حقوق حاصل ہیں۔ انہیں ملکیت کا حق ہے :وہ جائیداد خرید و فروخت کر سکتے ہیں، زمین کے مالک بن سکتے ہیں اور ان کی ملکیت کو ریاست تحفظ دیتی ہے؛ ان کا مال ناجائز طور پر لینا اسی طرح حرام ہے جس طرح کسی مسلمان کا۔ انہیں پیشے اور تجارت کی مکمل آزادی ہے :وہ تجارت، صنعت، زراعت اور ملازمت) چند مخصوص مذہبی مناصب کے سوا (اختیار کر سکتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلامی ریاستوں میں غیر مسلم تاجر، بینکار اور طبیب اعلیٰ درجوں تک پہنچے۔ ان پر زکاۃ عائد نہیں ہوتی کیونکہ زکاۃ ایک عبادت ہے جو صرف مسلمانوں پر فرض ہے؛ البتہ ان سے جزیہ لیا جاتا تھا جس کے بدلے ریاست ان کے تحفظ کی ذمہ دار ہوتی اور وہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔ معاشی تحفظ کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی ذمی غربت یا بڑھاپے کی وجہ سے کمانے سے قاصر ہو جائے تو بیت المال سے اس کی کفالت کی جائے گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے یہودی بھکاری کو دیکھ کر بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرمایا اور کہا کہ جوانی میں اس سے فائدہ اٹھا کر بڑھاپے میں اسے چھوڑ دینا انصاف نہیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے معاہدۂ حیرہ میں بھی معذور و بوڑھے ذمیوں کے لیے بیت المال سے کفالت کی شرط درج تھی۔

عدالتی و سماجی تحفظ

قانون کی نظر میں اقلیتوں کی جان و مال کا تحفظ مسلمانوں کے برابر ہے۔ فقہاء کا متفقہ موقف ہے کہ ذمی کا خون مسلمان کے خون کی طرح محترم ہے اور اس کے قتل پر قصاص و دیت کے احکام لاگو ہوتے ہیں؛ اس کے مال کی چوری پر بھی وہی حد نافذ ہوتی ہے۔ عدالت میں اس کی گواہی اپنے معاملات میں قبول کی جاتی ہے اور اسے انصاف تک مکمل رسائی حاصل ہے۔ سماجی سطح پر ان کے ساتھ حسنِ سلوک، عیادت، ہدیہ و شادی بیاہ کی دعوتوں میں شرکت جائز و

مستحب ہے؛ قرآن نے ان اہلِ کتاب کے ساتھ جو لڑائی نہیں کرتے، بھلائی اور انصاف کرنے کی اجازت بلکہ ترغیب دی ہے)الممتحنہ(8 :۔ البتہ ان حقوق کے ساتھ اقلیتوں پر بھی ریاستی قانون کی پاسداری، ٹیکس کی ادائیگی اور عوامی امن میں شریک ہونے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یوں یہ رشتہ یک طرفہ رعایت نہیں بلکہ حقوق و فرائض کا متوازن معاہدہ ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں اقلیتوں کے حقوق کی نوعیت عارضی رواداری کی نہیں بلکہ شرعی معاہدے) عہدِ ذمہ (کی ہے جس کی حفاظت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ضمانت میں ہے۔ مذہبی حقوق میں عقیدہ و عبادت کی آزادی، عبادت گاہوں کا تحفظ، شخصی قوانین پر عمل اور مذہبی تعلیم شامل ہیں؛ معاشی حقوق میں ملکیت، تجارت و پیشے کی آزادی، زکاۃ سے استثناء، جزیے کے عوض فوجی خدمت سے exemption اور حاجت کے وقت بیت المال سے کفالت شامل ہیں۔ ان حقوق کی پامالی کرنے والا حکمران یا شہری صرف قانون کا نہیں بلکہ اللہ و رسول سے کیے گئے عہد کا مجرم ٹھہرتا ہے۔ یہی تحفظاتی نوعیت اسلامی ریاست میں اقلیتوں کو امن، عزت اور ترقی کا ایسا ماحول فراہم کرتی ہے جس کی مثالیں تاریخ میں وافر ملتی ہیں۔

سوال نمبر ۵ :موجودہ تعلیمی نظام میں دینی و دنیاوی تقسیم کے نقصانات 20) نمبر(

سوال نمبر ۵۔ موجودہ تعلیمی نظام میں دینی اور دنیاوی تقسیم کے کیا نقصانات ہیں؟

تعارف

مسلمان معاشروں کے موجودہ تعلیمی نظام کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہاں تعلیم دو متوازی اور الگ تھلگ دھاروں میں تقسیم ہو چکی ہے :ایک طرف مدارس میں دی جانے والی دینی تعلیم ہے اور دوسری طرف اسکولوں، کالجوں اور جامعات کا دنیاوی نظام۔ اسلامی تاریخ کے سنہرے دور میں ایسا کوئی انقسام موجود نہ تھا؛ ایک ہی جامعہ میں فقہ و حدیث کے ساتھ طب، فلکیات، ریاضی اور فلسفہ پڑھایا جاتا تھا اور ابنِ سینا و خوارزمی جیسے علماء دونوں علوم کے ماہر تھے۔ موجودہ تقسیم برطانوی استعماری دور کی پیداوار ہے جس نے دینی تعلیم کو سرکاری سرپرستی سے محروم کر

کے الگ تھلگ کر دیا۔ اس تقسیم نے مسلمان معاشرے کو فکری، سماجی، معاشی اور تہذیبی لحاظ سے گہرے نقصانات پہنچائے ہیں، جن کا جائزہ ذیل میں لیا جاتا ہے۔

فکری نقصانات :علم کی وحدت کا خاتمہ اور دوہری شخصیت

اسلام میں علم ایک وحدت ہے؛ ہر وہ علم جو انسانیت کے لیے نافع ہے، دینی قدر رکھتا ہے۔ تقسیم نے یہ تصور ختم کر دیا :اب" دینی علم "کا دائرہ عبادات و فقہ تک محدود سمجھا جاتا ہے اور سائنس و جدید علوم کو" دنیاوی "کہہ کر دین سے باہر تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا پہلا نقصان یہ ہوا کہ پورا معاشرہ دو متضاد ذہنیتوں میں بٹ گیا۔ دنیاوی اداروں کا فارغ التحصیل نوجوان دین کو پرانے زمانے کی چیز سمجھنے لگتا ہے، جب کہ مدارس کا فارغ التحصیل جدید علوم کو الحاد کا دروازہ خیال کرتا ہے۔ یوں ایک ہی شخصیت کہیں دینی شعور سے خالی تو کہیں عصری شعور سے بے بہرہ رہ جاتی ہے۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ علم کی تخلیقی اسلامی جہت ختم ہو گئی :جب مسلمان عالم سائنس کو اجنبی سمجھے گا تو وہ اس میں اجتہاد و تحقیق کا اسلامی نقطۂ نظر پیش نہیں کر سکے گا اور جب سائنسدان دین سے ناواقف ہو گا تو وہ اخلاقی رہنمائی سے محروم ہو جائے گا۔ یہی فکری انقسام مسلم دنیا کی علمی پسماندگی کی جڑ ہے۔

دینی نقصانات :عصرِ حاضر سے لاتعلقی

اس تقسیم کا دینی زندگی کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ مدارس کے نصاب میں اگر جدید معاشی، طبی، سیاسی اور ابلاغی مسائل شامل نہ ہوں تو علماء عصری مسائل — بینکاری و بیمہ، اعضاء کی پیوند کاری، ڈیجیٹل کرنسی، میڈیا کے احکام، ماحولیات — پر عوام کی رہنمائی سے قاصر رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عوام دینی رہنمائی کے لیے غیر معیاری ذرائع کی طرف رجوع کرتے ہیں یا دین کو زندگی سے الگ کر کے صرف رسومات تک محدود کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف اسکولوں و جامعات میں دینی تعلیم محض ایک رسمی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے جو نہ عقیدہ بناتی ہے نہ کردار؛ نتیجتاً ڈگری یافتہ طبقے میں دینی معلومات و عمل کی کمزوری بڑھتی جاتی ہے۔ اس طرح دونوں طرف سے دین کو نقصان پہنچتا ہے : ایک طرف اس کے وارث عصری زندگی سے کٹ جاتے ہیں اور دوسری طرف زندگی کے اصل کارندے دین سے بیگانہ ہو جاتے ہیں، اور معاشرے میں سیکولر اور مذہبی طبقے کے درمیان کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔

سماجی نقصانات :طبقاتی تقسیم اور باہمی بداعتمادی

تعلیمی تقسیم نے معاشرے کو دو سماجی طبقات میں بانٹ دیا ہے جن کی زبان، لباس، تہذیب اور طرزِ فکر بھی الگ الگ ہو گئے ہیں۔ یہ تقسیم باہمی احترام کے بجائے تحقیر و بداعتمادی کو جنم دیتی ہے :دنیاوی طبقہ مذہبی طبقے کو "پسماندہ "اور مذہبی طبقہ دنیاوی طبقے کو "بے دین "سمجھنے لگتا ہے۔ قومی سطح پر اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کسی مشترکہ قومی ایجنڈے پر متفق نہیں ہو پاتا؛ تعلیمی پالیسی، نصاب اور زبان جیسے فیصلوں پر ہمیشہ دو مخالف دھڑے آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ اور سماجی میل جول میں بھی دوری پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بھی بڑا نقصان یہ ہے کہ معاشرے کی قیادت دو نیم تعلیم یافتہ گروہوں میں بٹ جاتی ہے :سیاسی و انتظامی قیادت کے پاس دینی و اخلاقی شعور کی کمی اور مذہبی قیادت کے پاس انتظامی و عصری مہارتوں کی کمی، جس سے قومی فیصلے ہمیشہ ادھورے رہتے ہیں۔

معاشی نقصانات :بے روزگاری اور مہارت کا فقدان

معاشی لحاظ سے تقسیم دونوں طبقات کو نقصان پہنچاتی ہے۔ مدارس کے لاکھوں فارغ التحصیل طلبہ عصرِ حاضر کی معیشت کے لیے درکار مہارتوں — زبان، کمپیوٹر، حساب، تدریس کے جدید طریقے — سے کماحقہ لیس نہ ہونے کی وجہ سے بے روزگاری یا کم آمدنی والی ملازمتوں تک محدود رہتے ہیں، حالانکہ ان کی ذہانت و محنت کسی سے کم نہیں ہوتی۔ دوسری طرف دنیاوی اداروں میں کردار سازی اور امانت و دیانت کی تربیت کا فقدان معیشت کو بدعنوانی، رشوت، دھوکا دہی اور کام چوری کی صورت میں بھاری قیمت چکاتا ہے؛ تعلیم یافتہ طبقے کی اخلاقی کمزوری پورے معاشی نظام کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ مجموعی طور پر قوم کے افرادی قوّت کا بڑا حصہ یا تو مہارت سے محروم رہتا ہے یا اخلاق سے، اور دونوں صورتوں میں قومی پیداوار و ترقی متاثر ہوتی ہے۔ انسانی وسائل کا یہ ضیاع اس تقسیم کا سب سے مہنگا نقصان ہے۔

حل کی سمت :متوحد و مربوط نظامِ تعلیم

ان نقصانات کا حل تقسیم کو ختم کر کے ایک مربوط نظامِ تعلیم قائم کرنے میں ہے جس میں ہر طالب علم کو دینی بنیاد اور عصری مہارت دونوں حاصل ہوں۔ اس کے لیے مدارس کے نصاب میں جدید علوم، سائنس، زبان اور کمپیوٹر کو

مناسب جگہ دی جائے اور اسکول و جامعات کے نصاب میں قرآن و سیرت اور اخلاقیات کو زندہ و مؤثر انداز میں شامل کیا جائے۔ مشترک مضامین، مشترکہ اساتذہ کی تربیت اور جامعات میں دینی و سائنسی شعبوں کے باہمی روابط سے یہ خلیج کم کی جا سکتی ہے۔ ترکی، ملائیشیا اور بعض دیگر ممالک نے مربوط نصاب کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ مقصد یہ نہیں کہ ہر شخص عالم بھی ہو اور سائنسدان بھی، بلکہ یہ ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شہری کو دین کی بنیادی سمجھ اور ہر عالم کو عصر کی بنیادی واقفیت حاصل ہو، تاکہ علم کی وحدت دوبارہ بحال ہو سکے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ دینی و دنیاوی تعلیم کی موجودہ تقسیم ایک استعماری ورثہ ہے جس نے مسلمان معاشرے کو ہر جہت سے نقصان پہنچایا ہے :فکری طور پر علم کی وحدت اور شخصیت کی یکجائی ختم ہو گئی؛ دینی طور پر علماء عصر سے اور عوام دین سے کٹ گئے؛ سماجی طور پر معاشرہ دو باہم مخالف طبقات میں بٹ گیا؛ اور معاشی طور پر ایک طبقہ مہارت سے اور دوسرا اخلاق سے محروم رہ گیا۔ جب تک تعلیم کو ایک متوحد، مربوط اور مقصدی نظام کی صورت نہیں دی جاتی، مسلمان معاشروں کی علمی، اخلاقی اور معاشی پسماندگی پر قابو پانا ممکن نہیں۔ اسلام کا اصل تصورِ تعلیم یہی ہے کہ ہر نافع علم اللہ کی نشانیوں کو سمجھنے اور انسانیت کی خدمت کا ذریعہ ہے، خواہ اس کا تعلق مسجد سے ہو یا تجربہ گاہ سے۔